

تفسیر "فصل الخطاب" سے اقتباسات (حصہ اول)

<?xml encoding="UTF-8?">

تفسیر فصل الخطاب سے اقتباسات (حصہ اول)

مؤلف : سید العلماء آیت اللہ سید علی نقی نقن (رحمۃ اللہ علیہ)

ترتیب وتنظیم : سید مون کاظمی

پیشکش : کونوا مع الصادقین گروپ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نزول قرآن کی تاریخ

اسمیں کوئی شبہ نہیں کہ قرآن رسالت مآب صلی اللہ علیہ والہ وسلم پر تدریجی حیثیت سے موقع ومحل کے اقتضا سے نازل ہوتا تھا اور اسی اعتبار سے اسمیں ماضی ، حال اور مستقبل کے واقعات کی تفریق ہوئی ہے یعنی پہلے ہوجکنے والے واقعات ماضی کے الفاظ سے اور بعد میں ہونے والے مستقبل کی حیثیت میں اور موجودہ حالات کا تذکرہ حال کی صورت میں کیا گیا ہے۔

روز وقوع واقعہ آنے والی آیت میں "الیوم" یعنی آج کی لفظ اور آئندہ کے تذکرہ میں حروف "سین" اور لفظ "سوف" کے ساتھ قریب اور بعید کے حدود قائم کرتا ہے۔ اس اعتبار سے قرآن مجید کے نزول کی کوئی ایک تاریخ مقرر کرنا صحیح نہیں ہے۔ کیونکہ وہ تیئس (23) برس کے عرصہ میں جستہ جستہ نازل ہوا ہے۔ لیکن جب ہم قرآن مجید کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں اسمیں نزول قرآن کی تاریخ کا ذکر ملتا ہے۔ اکطرف یہ ارشاد کہ "شہر رمضان الذی انزل فیہ القرآن" رمضان کا مہینہ وہ ہے جسمیں قرآن نازل کیا گیا" اسمیں قرآن مجید کے نزول کو گیارہ مہینوں سے ہٹا کر ایک مہینے میں محدود کیا گیا۔ دوسری طرف ارشاد ہوا کہ

"ابانزلناہ فی لیلة مبارکة" ہم نے اسکو ایک بابرکت رات میں نازل کیا" (دخان#03)

اس سے پتہ چلا کہ یہ تنزیل کی ابتداء کسی خاص رات میں ہوئی۔ اب ان دونوں آیتوں کو ملا کر یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ وہ ماہ رمضان کی کوئی ایک رات ہے اور پھر ایک پورا سورہ "سورۃ القدر" اسمیں انضباط مکمل طریقہ سے کیا گیا کہ

"انا انزلناہ فی لیلة القدر" ہم نے اسکو شب قدر میں اتارا ہے"

اب ان تینوں آیات سے یہ تعین ہوا کہ نزول قرآن شب قدر میں ہوا ہے اور وہ ماہ رمضان کی ایک رات ہے۔ اب وہ کہ جو قرآن کو قدیم اور بطور کلام نفسی کے ازل سے "ذات الہی" میں ثابت سمجھتے ہیں انکے لئے یہ سوال

پیدا ہوتا ہے کہ موجودہ الفاظ جو "کاشف اور حاکی" ہیں کلام حق کے، وہ تو کسی ایک وقت پر نازل نہیں ہوئے بتدریج اترے، لہذا انکی یہ تاریخ ہو ہی نہیں سکتی اور "قدیم چیز قدیم" ہے اسکی کوئی ابتداء نہیں پھر اسکے لئے تاریخ مقرر کرنے کے کیا معنی؟؟؟

لیکن ہم کہ جو قرآن کو حضرت احدیت کا مخلوق جانتے اور اسی حیثیت سے اسکو کلام الہی مانتے ہیں ان آیات کی بتائی ہوئی تاریخ کو اسی "ابشاء و خلق" سے متعلق سمجھتے ہیں جو "عالم ملاء علی" میں صورت پذیر ہوا یا تنزیل کے لفظ سے مراد "تنزیل اول" ہے جو "لوح محفوظ" سے "بیت معمور" کی طرف ہوئی۔ حدیث معصوم "سئل صادق (ع) فقال انزل جملة وحدة في شهر رمضان الى البيت المعمور ثم نزل من البيت المعمور الى النبي صلى الله عليه واله في طول عشرين سنة" (تفسیر علی بن ابراہیم قمی)

قرآن کے معانی

"لغوی معانی"

"قرآن" قراءت کی طرح "قرء" سے ماخوذ ہے جسکے اصل معنی لغت عربی میں "جمع" کرنے کے ہیں کتاب کے عام رواج سے پہلے کسی نظم یا نثر کو جمع کرنا اسطرح کہ وہ محفوظ ہو جائے اور اسکا بہترین طریقہ یہی تھا کہ اسے سینہ میں ازبر کر لیا جائے اس بناء پر صدر اسلام میں "قراءت" بہ معنی حفظ مستعمل ہوتا تھا اور حافظ قرآن کو "قاری" کہتے تھے۔

چونکہ یہی حفاظ حروف قرآن کے طریقہ ادا اور انکے مخارج و کیفیات سے واقف ہوتے تھے اور اسے لحن کے ساتھ پڑھتے بھی تھے۔

رفتہ رفتہ "قراءت" بہ معنی علم مخارج حروف ہو گیا اور "قاری" یعنی مخارج کا جاننے والا چاہے وہ حافظ نہ ہو لیکن یہ بعد کے زمانہ کا محاورہ ہے۔ صدر اسلام میں ایسا نہیں تھا۔

پھر چونکہ جمع یعنی کسی تحریر ہر حاوی ہونے کا ایک ادنیٰ درجہ یہ بھی ہے کہ انسان پوری تحریر پر نظر ڈالے یا زبان پر اسے جاری کرے۔ اسلئے "قراءت" کے معنی مطلق پڑھنے کے بھی ہو گئے اور یہ محاورہ بھی نزول قرآن کے پہلے سے موجود تھا۔

چنانچہ پہلی وحی جسکا آغاز "اقرا" سے ہوا ہے اسی مفہوم کی حامل ہے اور بعید نہیں کہ کتاب الہی کے لفظ "قرآن" سے موسوم ہونے کا تعلق اس "اقرا" کے ساتھ بھی سمجھا جائے جس سے اس کتاب کے نزول کا آغاز ہوا ہے۔ جسکے ماتحت نمازوں میں "قراءت" کے معنی اسی کتاب کے سوروں کا پڑھنا ہوا نہ کہ تسبیح وغیرہ دوسری چیزوں کا پڑھنا چاہے انکا پڑھنا واجب بھی ہو۔

جسطرح کتاب بمعنی مکتوب اور بیان بمعنی "مبین" بلا تکلف استعمال ہوا ہے۔ اسی طرح "قرآن" مقرر اور محفوظ کے مفہوم کا اعتبار کر کے خداوندی محاورہ میں نام بن گیا ہے۔ ان الفاظ و کلمات کو جو بطور وحی "جبرئیل امین علیہ السلام" کے توسط سے حضرت خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر بحیثیت معجزہ اتارے گئے ہیں۔

"اصطلاحی معانی"

"قرآن مجید" کے اصطلاحی معنی کہ "وہ کلام جو بطور وحی حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ والہ وسلم پر بحیثیت معجزہ اتارا گیا ہے" ایک ایسے ساری و جاری مفہوم کی حیثیت رکھتے ہیں جسکے لحاظ سے کل اور جزء ، کم اور زیادہ یہاں تک کہ ایک آیت بلکہ بعض اجزائے آیت بھی "قرآن" کا مصداق ہیں بلکہ ایک لفظ پر بھی جبکہ اسکا لکھا جانا "جزو قرآن" ہونے کے قصد سے معلوم ہو۔ اسلئے فقہ کی رو سے بغیر طہارت اسکا مس کرنا بھی حرام ہوگا۔ لیکن جیسا کہ صاحب معالم کو اسکی حقیقت کی طرف توجہ ہوئی ہے۔

بظاہر دوسری وضع کے ساتھ یہ لفظ اس پوری کتاب کے نام کیلئے معین ہوئی ہے جو اس وحی کے اجزاء کا مجموعہ ہے۔ اس طرح ایک ایک لفظ اور ایک ایک آیت اور ایک ایک سورۃ کو پہلے معنی کے لحاظ سے "قرآن" کہنا درست ہے اور دوسرے معنی کے لحاظ سے "جزء قرآن"۔

"نتیجہ"

مذکورہ بیان سے یہ پتہ چلا کہ "قرآن" کے "لغوی و اصطلاحی" سب ملاکر تین معانی ہیں

- ایک بمعنی مصدر یعنی جمع کرنا یا محفوظ کرنا۔
- دوسرے وہ ساری و جاری عام مفہوم جسکے لحاظ سے ایک ایک جملہ اور ایک ایک حرف قرآن ہے۔
- تیسرے اس پوری کتاب کا نام۔

خود "قرآن کریم" میں لفظ "قرآن" کے ان تینوں معنوں کی سند موجود ہے

(1) - "ان علینا جمعه وقرآنه" یہاں لفظ قرآن کی اضافت کتاب کی طرف اور جمع پر عطف بتا رہا ہے کہ اسکے معنی مصدری یعنی "ضبط و حفظ" مراد ہیں۔

(2) - "انه لقرآن کریم فی کتاب مکنون لا یمسه الا المطہرون" یہاں قرآن کا وہی جامع اور عام مفہوم مراد ہے جو "جزء و کل" سب پر صادق ہے اور اسی لئے بغیر طہارت مس کرنے کی ممانعت کل "قرآن" سے مخصوص نہیں بلکہ "اجزائے قرآن" میں بھی ثابت ہے۔

(3) - "ولقد اتینک سبعامن المثنی والقرآن العظیم" ہم نے آپکو عطا کیں سات دو رنگ والی آیتیں اور قرآن عظیم۔ یہاں قرآن کا اطلاق "مجموعہ کتاب" پر ہے جس سے "سورہ حمد" کا صرف بنظر اہمیت و خصوصیت الگ کر کے ذکر کیا گیا ہے اور قرآن کے اسی لحاظ سے حضرت علی علیہ السلام کا قول وارد ہوا ہے کہ "جو کچھ قرآن میں ہے وہ "سورہ حمد" میں ہے"